© rasailojaraid.com

حالات وواقعات

ڈاکٹر اسلم فرخی

میری علمی ومطالعاتی زندگی

[عرفان احمد بھٹی اور عبدالرؤف کے مرتب کردہ سوال نامہ کے جواب میں لکھا گیا]

اگر میں بیان کرنا شروع کروں گا تو آج کا دن کل کے دن میں بدل جائے گا لیکن میرے دل کا حال پھر بھی بیان نہیں ہو سکے گا، چونکہ ہر آدمی جو میری عمر کا ہے اور جس نے لمبی زندگی گزاری ہے، اُسے اپنی عمر کے آخری حصے میں پہنچ کر ماضی کی بازیافت سے بہت دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ میں تو عملاً کبھی اپنے حالات زندگی کے بارے میں گفتگو نہیں کرتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اپنے بارے میں کچھ کہنا نہایت مشکل بات ہے۔ اگر صحیح بات کہوں تو سننے والے یہ کہتے ہیں کہ صاحب بڑی تعلّی سے کام لیا اور بہت غلو سے کام لیا۔ اختصار برتوں تو سننے والے کچھ اور سوچیں گے۔

بہت مختصر بیان کرنا چاہوں تو اتنا کافی ہے کہ میں 23 اکتوبر 1924ء کو لکھنو میں پیدا ہوا۔ میں نے ابتدائی تعلیم بھی وہیں حاصل کی۔ میری ننھیال لکھنو ہی میں تھی اور میرے نانا وہاں رہتے تھے اور میں چونکہ اُن کی بڑی بیٹی کا بڑا بیٹا تھا اور اُن کے ہاں کوئی اولادِ نرینہ نہیں تھی، اس لیے انہوں نے مجھے بیٹے کی طرح پالا اور چاہا۔ جب میں بڑا ہو گیا تو میں اپنے والد کے پاس فتح گڑھ آ گیا جو ضلع فرخ آباد کا صدر مقام ہے۔ میرے نانا اور میرے دادا دونوں کا خاندانی کام کتابوں کی اشاعت کا تھا اور دونوں کے پریس تھے، تو نانا نے بہت سی کتابیں شائع کیں اور مشہور شاعر داغ دہلوی کے وہ تمام مجموعے جو رام پور میں مرتب ہوئے، اُن کے حقوق میرے نانا کے پاس تھے۔ گلزار داغ، آفتاب داغ اور فریاد داغ وغیرہ۔ پھر اُس کے علاوہ ایک اور سلسلہ تھا جس میں آلہا نظم گائی جاتی تھی۔ وہ ایک خاص لے میں گائی جاتی تھی اور اچھے پڑھنے والے وہ نظم پڑھتے تھے۔ مسلمانوں نے بھی ایک نظم لکھی جس کا نام تھا اسلام کھنڈ اور اُس میں غزوات کے بارے میں اُسی زبان میں شاعری کی گئی تھی۔ وہ بھی بڑے شوق سے گائی جاتی تھی، لوگ سنتے تھے اور اُس سے محظوظ ہوتے تھے۔ یہ کتاب بھی بڑی مشہور ہوئی۔

اس کے علاوہ پریس کا کام تھا۔ اُس زمانے میں Hand پریس ہوتے تھے۔ اب تو منٹوں میں چیزیں چھپتی ہیں، جب کہ اس وقت پتھر سے چھپائی کی جاتی تھی۔ کاتب پہلے کاغذ پر ایک خاص قسم کی روشنائی سے لکھتے تھے اور وہ پتھر پہ اُتاری جاتی تھی اور لکھنو میں بعض ایسے کاتب تھے جو کاپی نہیں لکھتے تھے بلکہ وہ معکوس رقم کہلاتے تھے۔ پتھر ان کے سامنے ایک چھوٹی میز پر رکھ دیا جاتا تھا اور وہ اُلٹے رخ پر لکھتے جاتے تھے یعنی معکوس انداز میں لکھتے جاتے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عبدالحلیم شرر کا جو رسالہ تھا دل گداز، وہ اسی طرح پتھر پہ لکھا جاتا تھا۔ میں نے دیکھا ہمارے ہاں کاتب صبح نو بجے آئے، ایک میز اُن کے سامنے رکھی گئی اور پتھر اُس پہ جمایا گیا اور دن بھر لکھتے رہے۔ ہمارے پردادا کے ہاں بھی پریس تھا۔ وہ بھی کتابیں چھاپتے تھے اور مصنف بھی تھے۔ انہوں نے بعض اچھی کتابیں بھی چھاپیں۔ مثلاً اُن کی چھاپی ہوئی کتاب تاریخ فرخ آباد بہت مشہور ہوئی۔ تو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مجھے بچپن ہی سے علم وادب کا ماحول ملا۔

یہ کتابیں کیسے لکھی جاتی ہیں، کتابیں لکھنے والے کون ہوتے ہیں، کتاب پڑھنے والے کون ہوتے ہیں، ان کے بارے میں تفصیل سے باتیں بعد میں ہوں گی۔ پہلے ذرا تحریک پاکستان کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔ میں قصبے کی مسلم لیگ کا سیکرٹری رہا۔ 1946ء کے الیکشن میں بھرپور حصہ لیا، گاؤں گاؤں پھرا۔ طالب علموں کا ایک گروہ تھا جو یہ کام کرتے تھے۔ سارے یوپی میں جو مسلمان طالب علم تھے، وہ یہی کام کرتے تھے۔ تو پھر نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان قائم ہوگیا۔

میں ستمبر 1947ء یہاں آیا اور ستمبر 1947ء ہی سے میں کراچی میں مقیم ہوں۔ یہاں میری نئی زندگی شروع ہوتی ہے۔ مجھے لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ اُس زمانے کی مقبول تحریک ترقی پسند تحریک تھی۔ مجھے اُس تحریک کے اغراض و مقاصد سے دلچسپی تھی۔ اپنے قصبے میں اُس تحریک کی ایک شاخ میں نے بھی قائم کر رکھی تھی۔ یہاں آ گیا تو یہاں ساری سرگرمیاں اس لیے ماند پڑ گئیں کہ میں ریڈیو میں مسودہ نگار کی حیثیت سے چلا گیا اور نظم اور نثر ساری چیزیں ریڈیو کے لیے وقف ہوگئیں۔ پانچ سال میں ریڈیو میں رہا اور اس دوران بہت کچھ لکھا۔ نظمیں لکھیں، غزلیں لکھیں، فیچر لکھے، گیت لکھے، تقریریں لکھیں، بچوں کی تقریریں لکھیں اور جب ریڈیو پاکستان سے سکول براڈ کاسٹ کا پروگرام شروع ہوا تو اُس کے بہت سے پروگرام لکھے۔ افسوس یہ ہے کہ کوئی چیز محفوظ نہیں ہے۔ بعض فیچر ایسے تھے جو مجھے خود پسند تھے۔ مثلاً خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے بارے میں رفیق رسول ﷺ کے عنوان سے فیچر لکھا تھا اور بڑی محنت سے لکھا تھا۔ بہت پسند کیا گیا تھا اور آفتاب عظیم ٹیلی ویژن کے ایک پروڈیوسر تھے، وہ جب ملتے تھے تو کہتے تھے کہ میں اس کی ایک ویڈیو کیسٹ بناؤں گا۔ وہ بھی مصروف ہوگئے، میرے پاس اب کچھ ریکارڈ بھی نہیں ہے۔ لیکن کبھی کبھی یاد آتا ہے کہ وہ بہت اچھا لکھا تھا۔ اس طرح واجد علی شاہ، بہادر شاہ ظفر پر فیچر تھے۔

فیچروں کے علاوہ ڈرامے بھی بہت سے لکھے۔ یہ سلسلہ چلتا رہا، لیکن میرا یہ ارادہ تھا کہ میں ریڈیو میں زندگی نہیں گزاروں گا۔ مجھے تدریس کا شوق تھا۔ میرے والد نے جب میٹرک پاس کیا تو اُن کو گورنمنٹ سکول میں جگہ مل گئی اور وہاں پڑھاتے رہے۔ لیکن اس دوران میں تحریک خلافت اور عدم تعاون کی تحریک شروع ہوئی اور مسلمانوں میں یہ تحریک چلی کہ انگریزوں کی ملازمت ترک کر دینا چاہیے تو انہوں نے ملازمت ترک کر دی، اس لیے یوں کہنا چاہیے کہ تدریس میرے خون میں شامل ہے۔ میں یہ سوچتا تھا کہ میں ان شاء اللہ تعالیٰ کسی کالج یا یونیورسٹی میں پڑھاؤں گا تو مجھے سندھ مسلم کالج میں جگہ مل گئی۔ اُس زمانے میں کالج بھی کم تھے اور تعلیم کا ماحول بھی ایسا نہیں تھا۔ سندھ مسلم کالج میں جگہ مل گئی، میں چلا گیا۔ بہت اچھا وقت گزرا۔ غلام مصطفیٰ شاہ صاحب پرنسپل تھے اور وہ بڑی زبردست شخصیت کے حامل تھے۔ ہمدرد تھے۔ جب تک زندہ رہے اُن سے تعلقات رہے اور میری طرح بہت سے نوجوان لوگ تھے جو پڑھا رہے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پھر یہ ہوا کہ مرکزی حکومت نے سنٹرل گورنمنٹ کالج قائم کیا جواب بھی ہے تو اُس کالج میں پبلک سروس کمیشن نے اساتذہ کا تقرر کیا۔ تو اُس میں میرا بھی تقرر ہو گیا، میں بھی وہاں چلا گیا۔ نیا کالج تھا اور پڑھانے والے بھی نئے تھے۔ آدھا حصہ مغربی پاکستان اور آدھا حصہ بنگالی اساتذہ کا تھا مگر یہ کہ روابط ایسے تھے کہ بنگالی اور غیر بنگالی میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اتنے اچھے اور بے تکلف تعلقات تھے اور وہ اس طرح گھل مل گئے تھے کہ دن رات اُن کے گھروں میں جانا اور اُن کا ہمارے ہاں آنا۔ ساری باتیں تھیں۔ وہیں میں نے ''محمد حسین آزاد کی حیات اور تصانیف'' کے عنوان سے اپنی پی ایچ ڈی کا Thesis لکھا۔ یہ دو جلدوں میں تھا اور مجھے بعد میں آدم جی ایوارڈ بھی ملا تھا۔ پھر گورنمنٹ کالج سے میں کراچی یونیورسٹی آ گیا۔ شعبہ اردو میں آ گیا، بہت خوش رہا، بہت اچھا ماحول تھا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی تھے۔ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی تھے، ڈاکٹر شاہ علی تھے، ڈاکٹر فرمان فتح پوری تھے، اساتذہ کا ایک پورا گلدستہ تھا۔ کراچی یونیورسٹی اُس زمانے میں اعلیٰ تعلیم کا ایک بہت بڑا اور بہت اچھا مرکز بھی تھی۔ ہر شعبے میں ایسے اساتذہ تھے جو بین الاقوامی سطح پر نامی گرامی سمجھے جاتے تھے۔ مثلاً تاریخ کے شعبے میں ڈاکٹر اشتیاق حسن قریشی اور ڈاکٹر محمود حسین تھے۔ ڈاکٹر یوسف تھے جو عربی کے بہت بڑے اسکالر تھے۔ فارسی میں ڈاکٹر غلام سرور تھے، ڈاکٹر ملیح الامام عابد علی خان تھے یہ جو نام میں آپ کو گنوا رہا ہوں، یہ وہ لوگ تھے جنہیں اپنے موضوع پر بہت بڑا عالم اور مستند سمجھا جاتا تھا۔ لکھنے پڑھنے کا بہت عمدہ دور گزرا۔

یہاں میں شعبہ تصنیف و تالیف کا ناظم رہا اور آخر میں یونیورسٹی کا رجسٹرار ہو گیا تھا، حالانکہ وہ ایک انتظامی کام ہے۔ چونکہ میں سینئر ٹیچر تھا، لہٰذا ہر معاملے میں ٹھیک سمجھا جاتا تھا۔ بڑا کامیاب رہا۔ وہاں سے نکلا تو ایک دن بھی گھر میں فالتو بیٹھنا نصیب نہیں ہوا۔ نور الحسن جعفری انجمن ترقی اردو کے ناظم تھے۔ انہوں نے کہا کہ آپ کل سے انجمن میں آ جائیں۔ میں نے کہا کہ ایک آدھ مہینے آرام کروں تو انہوں نے کہا کہ صاحب آپ کو کل آنا ہے تو انجمن میں مشیر کی حیثیت سے چلا گیا۔ وہاں کام کرتا رہا آٹھ دس سال۔ پھر اُس کے بعد صحت خراب ہو گئی تھی۔ گھر میں بیٹھ گیا۔ میرے حساب سے کوئی چار برس ہوئے ہوں گے کہ اردو یونیورسٹی کی سینٹ کا ممبر بن گیا۔ سینٹ نے مجھ سے یہ کہا کہ ہائر ایجوکیشن کمیشن نے ایک بڑی گرانٹ اس لیے دی ہے کہ اردو میں سائنس کی درسی کتابیں تیار کی جائیں۔ اردو یونیورسٹی تو بن گئی ہے اور یونیورسٹی بن جانے کا مطلب ہے کہ تدریس اردو میں ہو۔ سائنس بھی اردو میں پڑھائی جائے تو میں نے کہا کہ میری صحت اجازت نہیں دیتی، لیکن مجھے دو دفعہ کہا گیا تو مجھے قبول کرنا پڑا اس طرح شعبہ تصنیف و تالیف کا اعزازی نگران اعلیٰ بن گیا۔ ایم ایس سی اور آنرز کی سطح کے لیے سائنس کی درسی کتابیں لکھوا تا رہا ہوں۔ کتابیں شائع کیں، لیکن مجھے بڑے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے ملک میں کتاب لکھنے کا کوئی تصور نہیں ہے۔ کتابیں تو بہت ہیں، لیکن بعض بنیادی باتیں قابل توجہ ہیں اور وہ یہ ہیں کہ ادب اور شعر کی کتابیں تو آپ لکھتے ہیں اور سینکڑوں کی تعداد میں شائع ہوتی ہیں، لیکن علمی کتابیں بہت کم لکھی جاتی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایک مستند مکمل کتاب لکھنے کے لیے مصنف کا پوری طرح اپنے مضمون پر حاوی ہونا ضروری ہے۔ اگر وہ اپنے مضمون پر کامل دستگاہ نہیں رکھتا اور اُس کا علم Upto date نہیں ہے تو وہ ٹیکسٹ بک نہیں لکھ سکتا۔ چنانچہ بیشتر اساتذہ ٹیکسٹ بک لکھنے سے گھبراتے ہیں۔ میں نے سارے ملک میں دورے کیے۔ جامعات اور کالجوں میں گیا، سائنسی اداروں میں گیا۔ جو خوشامد کر سکتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھا کی کہ یہ علم کے فروغ کا مسئلہ ہے، مگر کسی نے کتاب لکھنے کی حامی نہیں بھری اور اب بھی یہی حال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی علمی اور تحقیقی کتابوں کی اشاعت کی رفتار بہت سست ہے۔

بچوں کی کتابیں بہت پڑھیں۔ دارالاشاعت پنجاب کا ایک ادارہ تھا، وہ ایک رسالہ ''پھول'' چھاپتے تھے، وہ پڑھا کرتا تھا۔ میری پہلی کہانی اس میں چھپی تھی۔ مجھے کتنی خوشی ہوئی تھی۔ کراچی آنے کے بعد میں نے شمس تبریزی کے ساتھ مل کر بچوں کا ایک رسالہ ''میرا رسالہ'' شائع کرنا شروع کیا۔ برسوں جاری رہا۔ ایک ادبی رسالہ ''نقش'' بھی شمس صاحب کے ساتھ جاری کیا۔ اُس سے آگے بڑھے تو جو کتاب ہاتھ لگی پڑھی۔ آب حیات اور نیرنگ خیال میں نے بچپن میں پڑھی۔ تب سے محمد حسین آزاد سے دلچسپی پیدا ہوگئی تو اب تک یاد ہے کہ نیرنگ خیال جو تھی وہ لمبے سائز پر تھی اور آب حیات بھی بڑے سائز پر تھی۔ میں نے پچاسوں بار پڑھی۔ اسی طرح دربار اکبری بھی پچاسوں بار پڑھی۔

شاعری کی بہت سی کتابیں پڑھیں، بچوں کی بھی، بڑوں کی بھی۔ میرے والد کو چونکہ انگریزی کی کتابیں پڑھنے کا غیر معمولی شوق تھا، وہ جو کتاب پڑھتے تھے میں دیکھتا تھا اور اس سے میرے شوق کو مہمیز ملتی تھی اور میں بھی اس کتاب کا مطالعہ کرتا تھا۔ ایک بات اور بھی ہے کہ کتابوں کے حوالے سے طلسم ہوشربا کا کلچر بھی تھا۔ وہ ہمارے یہاں اس طرح تھا کہ جو ہمارے مولوی صاحب تھے، وہ ہمارے یہاں رہتے تھے اور شام کو اُن کے دوست احباب اُن سے ملنے آتے تھے اور چونکہ وہ خود بھی شوق رکھتے تھے، اس لیے لالٹین روشن کی جاتی تھی۔ مولوی صاحب بہ آواز بلند طلسم ہوشربا پڑھتے تھے اور وہ بہت سے لوگ جو وہاں جمع ہوتے تھے، اسے سنتے تھے۔ بہت دفعہ میں بھی وہاں جا کر بیٹھا اور سنتا رہا۔ طلسم ہوشربا کو خود بھی پڑھنے کی کوشش تھی۔ اُس کی سات جلدیں تھیں اور پانچویں کی دو جلدیں ہیں، پنجم اول اور پنجم دوم۔ میں نے یہ کتاب اپنے لڑکپن میں پڑھ لی اور یہ دعویٰ تو نہیں کرتا کہ وہ سمجھ میں آئی۔ وہ روانی، وہ اسلوب، سجا ہوا مرصع طرز بیان لیکن پڑھا سب اور بڑا لطف حاصل کیا اور اُس کا بڑا اثر رہا۔ وہ ایک بڑی اہم کتاب رہی۔ دوسری داستانیں بھی تھیں طلسم نور پیکر ہے۔ طلسم نور افشاں ہے۔ اول نامہ، ایرج نامہ، بہت پڑھا اور بہت یاد رکھا اور میرا خیال یہ ہے کہ اگر اُس کو آسان زبان میں لکھ کر بچوں کے لیے ایک کتاب تیار کی جائے تو بہت دلچسپ رہے۔

میرے والد انگریزی میں کتابیں منگواتے رہتے تھے۔ بعض کتابوں کی کہانیاں انہوں نے مجھے سنائیں۔ مثلاً Victor Hugo کی کتاب Les Miserables کی کہانی میں نے انہی سے سنی تھی اور پھر مجھے یاد ہوگئی تھی اور پھر میں نے خود بھی پڑھی۔ اور بہت سی کہانیاں بھی سنیں جو میں نے بعد میں پڑھیں۔ انگریزی ناول پڑھنے کا جو سلسلہ شروع ہوا، وہ اب تک جاری ہے۔ اس طرح کی کتابیں بھی پڑھیں۔ پھر Mob lick پڑھی۔ بہت مشکل کتاب تھی، میری سمجھ سے ماورا تھی، لیکن پھر بھی میں نے پڑھی۔ پھر میں نے اس کو بار بار پڑھا اور پھر اُس پر ایک ریڈیو Play بھی لکھا۔ ڈارمے سے بڑی دلچسپی رہی۔ نئے ڈرامہ نگاروں کو پڑھا۔ اُن کے ڈراموں سے استفادہ کیا۔ تنقید پڑھی، تنقید نگاروں سے استفادہ کیا۔ انگریزی شاعروں سے استفادہ کیا۔ یہ پورا سلسلہ ہے جو آج تک جاری ہے۔

ادب کا شوق مجھے اپنے والد سے ورثے میں ملا، سارے خاندان کو ملا۔ میری ایک چھوٹی بہن تنقید بہت اچھی لکھتی تھیں۔ میرے ایک چھوٹے بھائی انوراحسن صدیقی معروف ادیب شاعر اور صحافی ہیں۔ میرے بچے اور پوتا پوتی ادبی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وراثت کے حصہ دار ہیں۔ میری بیوی ڈپٹی نذیر احمد کی پڑپوتی ہیں۔ انہوں نے شاہد احمد دہلوی کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے۔ ایک کتاب خدیجہ مستور کے بارے میں ہے۔ ایک کتاب ڈپٹی نذیر احمد کے بارے میں زیر طبع ہے۔ میرے بچوں کو ان کی ادبی وراثت سے بھی حصہ ملا ہے۔

محمد حسین آزاد کے ساتھیوں میں ڈپٹی نذیر احمد کا نام قابل ذکر ہے۔ میرا خیال ہے کہ جیسی گٹھی ہوئی نثر نذیر احمد نے لکھی ہے، اردو کے کسی انشا برداز نے نہیں لکھی۔ زبان پر، چہرہ نگاری پر، انسان کے کردار کو بیان کرنے پر اور تیز حس مزاح کے ساتھ وہ لاجواب اسلوب تحریر اور انداز نگارش کے حامل تھے۔ کیونکہ اُن کے سامنے ایک مقصد تھا، لہٰذا انہوں نے اپنی کتابوں میں اُس مقصد کو پورا ہوتا ہوا دیکھا۔ مولانا شبلی کی سیرت النبیؐ اعلیٰ کتاب ہے۔ شبلی کی سیرت النبیؐ کا جو پہلا ایڈیشن تھا، وہ میرے پاس ہے اور اتنے بڑے سائز پر پہلا اور دوسرا ایڈیشن تھا کہ اب اتنے بڑے سائز پر کتابوں کی اشاعت کا رواج نہیں رہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ ایڈیشن اگر نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔ بہت بڑے اہتمام سے شائع ہوا تھا۔ اسی طرح اور کچھ کتابوں کے پہلے ایڈیشن تھے، وہ لوگوں کے پاس سے میرے پاس بھی آئے۔

مشتاق احمد یوسفی صاحب کی نثر نہایت اعلیٰ قسم کی نثر ہے اور اردو اسلوب کے اعتبار سے یوسفی صاحب کا اردو نثر میں بہت اہم مقام ہے۔ محمد حسن عسکری کی نثر ایک صاحب اسلوب کی نثر تھی اور جو نثر اختصار، اجمال، جامعیت اور استعجاب کا نمونہ ہے، وہ سعادت حسن منٹو کی نثر ہے اور عصمت چغتائی کی نثر ہے۔ خدیجہ مستور کی نثر ہے۔ بڑی کاٹ دار بڑی چبھنے والی۔ ہمارا اردو ادب اچھے نثر نگاروں سے خالی نہیں تھا۔ شاہد احمد دہلوی سے میں نے نثر لکھنا سیکھی۔ ان کی شخصیت اور فن کا میری زندگی پر گہرا اثر ہے۔

نام سے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں کہ صاحب اُس کے افسانے کو اچھا کہہ دیا۔ بہت سے نام اور بھی ہیں۔ انتظار صاحب جو ہمارے عہد کے بڑے افسانہ نگار ہیں، انہوں نے اردو افسانے کو نئی جہت دی ہے۔ راجندر سنگھ بیدی نے کراچی کے فسادات پر بعض بہت اچھے افسانے لکھے۔ قاسمی صاحب اشفاق احمد کا اضافہ کر لیجیے۔ خالدہ حسین کا اضافہ کر لیجیے۔ یہ بہت اچھے اور اعلیٰ درجے کے افسانہ نگار ہیں۔ بعض اور افسانہ نگار بھی ہیں۔ نام کہاں تک گنواؤں۔

بیسویں صدی میں اتنا بڑا ناول ''آگ کا دریا'' لکھا گیا۔ خدیجہ مستور نے آنگن لکھا۔ آنگن اتنا خوبصورت اور مکمل بھرپور ناول ہے۔ قیام پاکستان کے پورے عمل کو، اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کے جذبات کو، اُن کی کوشش کو اور اُن کے مجاہدے کو، اُن کے جوش وخروش کو خدیجہ مستور نے جس طرح ظاہر کر دیا ہے، وہ بڑے کمال کی بات ہے۔ اسی طرح کاٹیڑھی لکیر ہے، اداس نسلیں ہے، علی پور کا ایلی ہے، راجہ گدھ ہے۔ سب اچھے ناول ہیں۔ اور آگ کا دریا ہے، قرۃ العین حیدر کے دوسرے ناول اور افسانے ہیں۔ زندگی اور وقت کا پورا طلسم ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا ''کیسے چاند تھے سر آسماں'' زبردست ناول ہے۔ فاروقی صاحب ناول، افسانے اور تنقید کا بہت بڑا نام ہیں۔ عہد ساز اور رجحان ساز ادیب ہیں۔ ہمہ جہت ادیب ہیں۔

مولانا امین حسن کی تفسیر تدبر قرآن مجھے بہت پسند ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کی مطالب القرآن جتنی بھی شائع ہوئی، بڑی زبردست اور فکر انگریز کتاب ہے۔ میں اس کتاب سے بہت متاثر ہوا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بات یہ ہے کہ سیرت کی کتب بڑی عقیدت سے لکھی گئی ہیں بڑی لگن سے لکھی گئی ہیں لیکن ہم سب کو اس پہ غور کرنا چاہیے کہ ابھی تک سیرت نگاری کا حق ادا نہیں ہوا۔ مسلمان قوم ہی دنیا بھر میں وہ قوم ہے جس نے تاریخ کے علم کو علمی حیثیت دی ہے۔ مگر ہمارے ہاں تاریخ کا صحیح افادہ نہیں ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر میں نے پڑھی ہے اور میں اُن کی ذہانت اور اُن کے علم اور اُن کے طرز بیان کا مداح ہوں۔ اُن کے خطوط کا مجموعہ غبار خاطر اردو نثر کا اعلیٰ نمونہ ہے اور اُن کی جو تفسیر ہے، بہت اچھی تفسیر ہے۔ اسی طرح مولانا مودودیؒ کی تفسیر ہے۔ میں مذہبی سکالر یا دانش ور کی لیاقت اور قابلیت پر رائے دینے کا اہل نہیں ہوں۔ مولانا مودودی کا اسلوب بڑا سادہ اور بڑا پرکشش ہے۔ اُن کی پوری تفسیر میں آپ کو بڑی کامیاب نثر نگاری کا احساس ہوتا ہے۔

تصوف سے دلچسپی اپنے نانا کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ انہیں بزرگان کرام سے بڑی دلچسپی تھی اور وہ بالعموم عرسوں میں شرکت کرتے تھے۔ نہ صرف میرے نانا جان عرسوں میں حاضری دیا کرتے تھے بلکہ ہمارے خاندان کے اور افراد بھی مزارات پر جایا کرتے تھے۔ اس طرح صوفیا سے دلچسپی مجھے وراثت میں ملی اور نتیجتاً میں نے امیر خسرو کا خصوصی مطالعہ کیا تو پھر میرا ذہن منتقل ہوا حضرت نظام الدین اولیاء کی طرف۔ خواجہ محبوب الٰہی کا خصوصی مطالعہ کیا اور میں بڑا متاثر ہوا اور میں اُن کی درگاہ میں سترہ سال تک مسلسل حاضر ہوا۔ میرا خیال ہے کہ میرا جو حاصل زندگی ہے، وہ میری کتاب ''دبستان نظام'' ہے۔ پانچ سو صفحے کی یہ کتاب اس مقصد کی خاطر لکھی گئی ہے کہ لوگ عام طور پر یہ تصور کرتے ہیں کہ صوفیائے کرام کے ہاں کرامتیں تھیں اور روحانی تجلیات تھیں۔ کبھی کسی نے یہ غور نہیں کیا کہ یہ سب کے سب جتنے بھی تھے، اپنے عہد کے عالم اور معاشرتی مصلح بھی تھے۔ ان لوگوں نے اپنی مثالی زندگیوں سے معاشرے میں اصلاح کا کام کیا۔ مثلاً حضرت نظام الدین اولیاء کے حوالے سے تاریخ فیروز شاہی میں ضیاالدین برنی نے لکھا ہے کہ کیفیت یہ ہوگئی تھی کہ لوگ مضافات سے حضرت کے دیدار کے لیے آتے تھے تو لوگوں نے راستے میں جگہ جگہ چھپرڈلوا دیے تھے اور وضو کے لیے لوٹے رکھوا دیے تھے۔ مصلے بچھوا دیے تھے تاکہ وہ نماز ادا کریں اور لوگ ایک دوسرے سے یہ پوچھتے تھے کہ بھائی فلاں نماز میں حضرت صاحب کون سی سورہ پڑھتے ہیں اور فلاں نماز میں کون سی سورہ پڑھتے ہیں۔ شام کو کیا ورد ہوتا ہے اور صبح کو کیا ورد ہوتا ہے اور اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ کون کون سے گناہ سے بچیں۔ تو صاحب اگر آپ کرامات کے قائل نہیں ہیں، تب بھی یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ انسانوں کے قلوب کو نیکی فلاح کی طرف راغب کیا اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ بزرگ علمی وادبی اعتبار سے ایک بڑے دبستاں کی حیثیت رکھتے تھے۔ ایک بہت بڑا ادارہ ایک بہت بڑا Institution تھے۔ دبستان نظام کا پہلا باب جو ہے، وہ حضرت سلطان جی رحمۃ اللہ علیہ کی معلومات کی گہرائی ظاہر کرتا ہے۔ مثلاً یہ کہ اتنا حاضر علم تھا کہ کسی نے قرآن مجید کی کسی آیت کا کوئی لفظ منہ سے نکالا تو آپ نے وہ آیت پڑھ دی۔ کسی نے کسی حدیث کا تذکرہ چھیڑا تو آپ نے اُس حدیث کی روایت بیان کردی۔ کسی نے کسی شعر کا مصرع پڑھا تو آپ نے پورا شعر پڑھ دیا۔ تو یہ چیز جو ہے یہ برجستگی اور تیزی یہ حافظہ یہ یادداشت، اس پہ قربان جانے کو دل چاہتا ہے۔

اسی انداز پر امیر خسرو کو تربیت حاصل ہوئی تو پھر انیس برس کی عمر میں انہوں نے پہلا دیوان مرتب کیا اور حضرت کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خدمت میں آئے۔ مسودہ دیا۔ حضرت نے ملاحظہ فرمایا اور کہا کہ بھائی اصفہانیوں کی طرح لکھا کرو اور پھر سمجھایا کہ اصفہانیوں کی طرح لکھنے کا مطلب کیا ہے اور اُن کی نظم ونثر کی اصلاح ہوتی رہی۔ کوئی کتاب امیر خسرو کی ایسی نہیں ہے جو حضرت سلطان جی کے ذکر سے معمور نہ ہو۔ حضرت امیر خسرو کی موسیقی کو چمکانے والے حضرت سلطان جی ہیں۔ پھر حسن سجز جو امیر خسرو کی ٹکر کے شاعر تھے۔ شبلی نے لکھا ہے کہ حسن اس پانے کے شاعر تھے کہ خسرو کو اُن پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ وہ برجستگی میں خسرو سے بڑے ہیں۔ خواجہ حسن سجز نے وہ کام کر دیا جو یادگار ہے۔ حضرت سلطان جی کے ملفوظات فوائد الفواد کے عنوان سے مرتب کیے۔ پندرہ سال کے فوائد لکھے ہیں۔ وہ کتاب ایسی ہے جو ملفوظات کا پہلا مستند مجموعہ ہے اور میرا خیال یہ ہے کہ ہندوستان میں بنگلہ دیش میں، ایران میں، افغانستان میں، وسط ایشیا میں ہر جگہ بڑی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے۔ پھر خواجہ ضیاء الدین برنی تاریخ فیروز شاہی والے نے تاریخ کا ہنر اور انداز حضرت سلطان ہی سے سیکھا۔ امیر خرد جنھوں نے ''سیر الاولیاء'' جیسی کتاب زبردست لکھی، ایسی جو چشتیہ سلسلے کی انسائیکلوپیڈیا ہے۔ جس ذات گرامی نے اِن لوگوں کی تربیت کی، وہ علم وادب کا نہایت اعلیٰ اور نہایت مستحکم دبستان تھا۔ میری کتاب دبستان نظام جس کے لکھنے میں، میں نے تین برس لگائے، اس کتاب کو لکھنے میں اس کا ابتدائیہ حضرت کی درگاہ دلی میں لکھا تھا۔ اس کا اختتامیہ مدینہ منورہ میں لکھا اور میں سمجھتا ہوں کہ میری زندگی کا اگر کوئی کام ہے تو یہی ہے۔ تصوف کے بارے میں پیرو مرشد ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان نے میرے بے ربط خیالات کی تہذیب کی، ان کا فیض میرے لیے بڑی نعمت تھا۔

فارسی میں ایک ہی کتاب کا حوالہ دیتا ہوں اور وہ فوائد الفواد ہے۔ شاعری جو ہے وہ وقت کے ساتھ ساتھ آدمی کو Haunt کرتی ہے۔ مثلاً یہ کہ آج امیر خسرو کا شعر پڑھیں تو آپ ہفتوں سر دھنتے ہیں۔ حافظ کا کوئی شعر پڑھا، کسی اور شاعر کا کوئی شعر پڑھا، اقبال کا کوئی شعر پڑھا، اُسی کو گنگنا رہے ہیں۔ تو ہر شاعر کا کوئی نہ کوئی شعر اچھا لگتا ہے۔ نظیری ہوں، فیض ہوں، بیدل، غالب ہوں، خسرو ہوں اور صاحب! آپ کے بڑے اچھے شاعر جنہیں آپ نہیں پڑھتے، وہ واقف لاہوری ہیں۔ کیا اچھی غزل ہے۔

هر غنچہ بشگفت الا دل من
اے وا دل من صد ادل من

اور بیدل تو بہت ہی بڑا شاعر ہے۔ غنیمت کی مثنوی نیرنگ عشق پہلے پڑھائی جاتی تھی۔ بیدل بڑے شاعر تھے اور ہمارے اپنے زمانے کی اقبال کی جو غزلیں ہیں جاوید نامہ میں، وہ اپنی جگہ ایک شاہ کار کی حیثیت رکھتی ہیں مگر افسوس یہ ہے کہ ہمارے ملک سے فارسی کا چلن اُٹھ گیا ہے اور ہم اپنے ادبی اور ثقافتی سرمایے کے بڑے حصے سے محروم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

جدید شاعروں میں جو بڑے شاعر ہیں، وہ سب بہت اچھے شاعر ہیں۔ میں جوش کو بھی پڑھتا ہوں، فیض کو بھی پڑھتا ہوں، منیر نیازی کو اور اپنے دوست احمد فراز کو بھی، قاسمی صاحب کو بھی، زہرہ نگاہ، کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض، فاطمہ حسن اور شاہدہ حسن کو بھی پڑھتا ہوں بلکہ فہمیدہ ریاض میں تو تصوف کی ایک لگن پائی جاتی ہے۔ مولانا روم کی جن غزلوں کا اردو میں ترجمہ کیا، وہ تو ایک بہت ہی نادر اور نفیس تجربہ ہے۔ مولانا روم کی مثنوی فارسی میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک تو فوائدالفواد میری زندگی میں سب سے بڑی کتاب ہے۔ میرے گھر کے ہر کمرے میں آپ کو یہ کتاب ملے گی۔ میری صبح کا آغاز ایک سپارے کی تلاوت اور فوائدالفواد کی ایک مجلس کے مطالعے سے ہوتا ہے۔ میں روزنامہ ڈان باقاعدہ پڑھتا ہوں۔ ورنہ 1942ء سے لے کر آج (8 مئی 2011) تک کے اخبارات باقاعدہ پڑھے اور ہندوستان میں دلی سے مسلم لیگ کا ایک اخبار نکلا کرتا تھا جس کا نام تھا منشور۔ حسن ریاض ایڈیٹر تھے، ان کی کتاب ''پاکستان ناگزیر تھا'' تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ وہ پڑھتا رہا، کراچی کے اردو اخبار بھی پڑھتا ہوں۔

دوران سفر چھوٹے چھوٹے سفر کے لیے کبھی کوئی اور کبھی کوئی کتاب ساتھ رکھ لیتا ہوں اور حقیقت تو یہ ہے کہ اب ایک ہی سفر کرنا باقی رہ گیا ہے جس میں مطالعے کا کوئی تصور نہیں ہے۔ دوران سفر اخبار پڑھ لیا، رسالہ پڑھ لیا۔ مطالعے کے لیے انسان کو اپنی پوری صلاحیتوں کو مجتمع کرنا پڑتا ہے۔ مجھے ہزاروں شعر یاد ہیں اور واقعی یہ بات بالکل صحیح ہے کہ مجھے بے شمار شعر یاد ہیں، تاریخیں یاد ہیں، واقعات یاد ہیں، نثر کے ٹکڑے یاد ہیں۔ حافظہ اچھا ہے۔ مثلاً کسی کا ٹیلی فون آیا کہ صاحب یہ شعر بتا دیجیے تو کہتے یہ ہیں کہ غالب کے دیوان میں ڈھونڈنا پڑے گا، آپ سے فوراً معلوم ہو جائے گا۔ اس طرح کے ٹیلی فون مسلسل آتے ہیں۔ اشعار یاد رکھنے کا ملکہ مجھے اپنے والد سے ورثے میں ملا ہے۔ انہیں ہزاروں شعر یاد تھے۔

میرے ذوق مطالعہ کا میرے بچوں پہ بہت اچھا اثر ہوا ہے۔ میرے بڑے بیٹے آمد کا جدید ادبیات میں مطالعہ مجھ سے بہت زیادہ ہے۔ وہ انگریزی میں بھی لکھتے ہیں اور ہم دونوں ادبی موضوعات پر تبادلہ خیال کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے استفادہ کرتے ہیں۔ وہ کوئی کتاب پڑھتے ہیں تو مجھے بتاتے ہیں، میں کوئی نئی کتاب پڑھتا ہوں تو میں اُن کو بتاتا ہوں۔ پھر اُس کے بعد گفتگو ہوتی ہے، مکالمہ ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ ضعف بصارت کی وجہ سے پڑھنا برائے نام رہ گیا ہے۔ آئے روز ایک نئی کتاب مجھے دکھاتے ہیں، مگر میں پڑھ نہیں سکتا، صرف افسوس کر سکتا ہوں۔

ہمارے ہاں کا دستور تھا لڑکوں کا ایک گروہ تھا جو چھپ کر گھٹیا جاسوسی ناول پڑھتے تھے ایک مصنف تھے جن کا نام تھا منشی ندیم صہبانی فیروز پوری۔ چار آنے میں اُن کا ناول آتا تھا۔ پیسے جمع کر کے اُن کا ناول لا کے پڑھتے تھے۔ پھر ہم نے اور ضمیر الدین احمد نے جو ہمارے دوست تھے یہ طے کیا کہ دلی جا کر منشی ندیم صبائی فیروز پوری سے ملاقات کرنا چاہے بعد میں یہ عقدہ کھلا کہ وہ اور جتنے اس طرح کے لکھنے والے تھے وہ اصل میں کاتب تھے اور وہ کتابت کی ہوئی کتاب بالعموم دس روپے پندرہ روپے میں پبلشرز کو دے دیتے تھے اب اُس زمانے میں پانچویں چھٹی جماعت میں وہ بہرام ڈاکو اور جاسوسوں کے کارنامے بڑے اچھے محسوس ہوتے تھے۔ بعد میں خیال آتا ہے کہ یہ کیا حماقت اور لغویت تھی۔

ذاتی لائبریری ہے تو سہی لیکن مرتب نہیں کیونکہ کتابیں رکھنے کے لیے جگہ نہیں ہے۔ میرے بزرگوں نے بہت کتابیں جمع کی تھیں۔ میں نے آپ کو بتایا کہ 15-16 ہزار کتابیں تھیں جو بعد میں ہندوستانی حکومت نے گھر کے سارے سامان کے ساتھ ضبط کر لی تھیں اور مجھے بڑا دکھ ہوا اور ساری زندگی رہے گا کہ وہ کتب خانہ صرف ساٹھ روپے میں نیلام ہو گیا تھا۔ بہت دن تک یہاں آ کر کتابوں کو جمع نہیں کیا پھر جمع کرنا شروع کیا۔ یہاں جگہ نہیں ہے بہت سی کتابیں میں کتب خانوں کو دے دیتا ہوں۔ میں نے ایک دن اندازہ لگایا تو مجھے یہ خیال آیا کہ کم از کم اب تک تیس چالیس برس میں میں ہزاروں کتابیں مختلف کتب خانوں کو دے چکا ہوں۔ انگلش Fiction کا بہت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بڑا Collection تھا۔ تو پھر آہستہ آہستہ اب صورت حال یہ ہے کہ اس گھر کے ہر کمرے میں کتابیں ہی کتابیں ہیں کتابیں اتنی ہوگئی ہیں کہ سارے گھر والے تنگ آ گئے ہیں اور یہ بھی سچی بات ہے کہ اُن کو جدا کرنے کو دل بھی نہیں چاہتا۔ مثلاً میں نے ابھی آپ کے سامنے تذکرہ کیا کہ سیرت النبیؐ کا جو پہلا ایڈیشن ہے وہ ہے میرے پاس، اب جی نہیں چاہتا کہ وہ ایڈیشن کسی کو دے دوں۔ بہت بڑا اطمینان ہے اور وہ اطمینان یہ ہے کہ میری کتابیں کباڑیوں کے ہاں نہیں جائیں گی کیوں کہ میری ساری کتابیں آصف سنبھال لیں گے ان کا گھر بھی اسی طرح کی کتابوں سے بھرا ہوا ہے اور یہ کہ اُن سے کہا ہے کہ تم جس کتب خانے کو بہتر سمجھو اُسے دے دینا۔

سینکڑوں کتابیں ضائع ہوئیں۔ افسوس ہوتا ہے جو لے گیا اُس نے واپس نہیں کی مگر یہ کہ ایک شاگرد ہے اُسے ضرورت ہے تو کتاب تو دینا پڑے گی۔ بعض اچھی ہیں ایسی ہیں مثلاً محمد حسین آزاد کی کتابوں کا پورا سیٹ میرے پاس ہے۔ اُن میں سے اگر کوئی کتاب ضائع ہو جائے تو وہ پھر مل نہیں سکتی۔

باقی زندگی کے لیے جو تین کتابیں پسند کرنے کی بات ہے، ان میں ایک تو فوائد الفواد ہوگی، دوسری کتاب دیوان غالب ہوگی اور تیسری کتاب یا دبستان نظام ہوگی۔

بہت سی ایسی تحریریں ہیں جن سے اشتعال پیدا ہوتا ہے۔ ایک تحریر تھوڑی ہے، بے شمار تحریریں ہیں۔ لوگ دل آزاری سے باز نہیں آتے۔ شائستگی کو مدنظر نہیں رکھتے۔ مجھے سفید رنگ پسند ہے۔ آپ کو کوئی دوسرا رنگ پسند ہے تو بھائی اس کی ضرورت نہیں ہے کہ مجھ میں اور آپ میں تکرار ہو اور آپ میری دل آزاری کے لیے سفید رنگ کو برا کہیں۔ یہ آج کی دنیا میں جو دل آزار چیزیں لکھی جا رہی ہیں اور ان کے پیچھے عصبیتیں ہوتی ہیں، وہ قابل نفرت ہوتی ہیں۔

اشتعال انگیز تحریریں نفرت پھیلانے اور خبث باطن کے اظہار کے لیے لکھی جاتی ہیں۔ دل آزاری کے لیے لکھی جاتی ہیں، فساد کرانے کے لیے لکھی جاتی ہیں۔ ہماری تعلیم تو یہ ہے کہ کسی کو برا نہ کہو، ہر بزرگ ہمارا بزرگ ہے۔ اس کی عزت کرو، یہ کیا کہ دوسرے بزرگوں کی مذمت شروع کر دی کوئی کارٹون بنانے لگا کوئی ناول لکھنے لگا، یہ سب نہایت تکلیف دہ باتیں ہیں اور خبث باطن کا اظہار ہیں۔ پھر ادب میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو ایک دوسرے کے خلاف لکھتے ہیں۔ تو وہ جو خلاف لکھتے ہیں تو اُن کو حق ہے کہ ضرور لکھیں کہ صاحب غالب جو تھا بڑا گھٹیا شاعر تھا۔ ٹھیک ہے صاحب بالکل ٹھیک ہے اگر آپ کی رائے ہے تو اس میں آپ اپنی رائے پر قائم رہیں۔ میں اپنی رائے پر قائم رہوں گا کہ غالب اچھے شاعر تھے۔ مگر آپ اگر یہ کہیں کہ فلاں شاعر یا نثر نگار تو ذلیل آدمی تھا کمینہ تھا قلاش تھا تو یہ تو دل آزاری کی بات ہوگی اور اس دل آزاری سے فضا اور ماحول خراب ہوگا، نفرت پھیلے گی۔ اگر آپ کسی شخص کی علمی یا ادبی حیثیت کے منکر ہیں تو آپ انکار کیجیے کوئی حرج نہیں لیکن گستاخی نہ کیجیے۔

میرے مطالعے کے اوقات مقرر نہیں۔ ہر وقت اور ہر جگہ یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ میں کتاب پر نشان نہیں لگاتا جو کچھ پڑھتا ہوں اسے ذہن میں محفوظ رکھتا ہوں اور حسب ضرورت اس سے فائدہ اٹھاتا ہوں۔ یہ سب باتیں اس وقت کی ہیں جب آتش جواں تھا۔ اب دنیا کے ستم جا دنہ اپنی ہی وفا یاد۔ یہ خواب وخیال وہ گیا۔ نہ کسی سے شکوہ ہے نہ کسی سے کوئی گلہ، سب اچھے ہیں۔ سارے لکھنے والے لائق تحسین ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو خوش رکھے۔

© rasailojaraid.com